مترجمہ مسز الیف۔ڈی۔وارث
بی۔اے، بی۔ٹی
ایچ۔پی

EAGLE BOOKS

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی۔لاہور

سلسلہ

بار اوّل (۵۰)

رہزنوں کے درمیان غیر مسلّح

گھڑی کے آٹھ بجاتے ہی مسز پٹیل اپنی گل کاری کو برطرف کرتے ہوئے یوں گویا ہوئی "بھبوڈور اب سونے کا وقت آگیا ہے"۔ اور یہ کہہ کر وہ اپنے نوعمر لڑکے کے قریب گئی۔ بتی کی روشنی میں لڑکے کے خوبصورت بھورے بال خوب چمک رہے تھے لیکن وہ اس سے بالکل بے خبر اپنی کتاب کے مطالعہ میں محو تھا۔ ماں کے قریب آنے پر اس نے اپنی آنکھیں کتاب سے اٹھا کر کسی قدر بے صبری کے ساتھ جواب دیا اور کہا۔ "اماں! بن مانس ابھی حملہ کرنے کو ہے۔ ذرا مجھے اس کا انجام تو دیکھ لینے دو"۔

ماں "یہ کل دیکھ لینا۔ اب اپنی کتاب کو بند کر دو اور آرام کرو"۔

لڑکا ماں کے حکم کی تعمیل کرتا ہوا فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ماں سے پوچھنے لگا۔ "اماں کیا یاد رہی میرے لئے روٹی کے خشک ٹکڑے لے آئی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور لائیگی"۔

ماں "خشک ٹکڑے کیسے؟ بھبوڈر تم ان سے کیا کرو گے"؟

لڑکا "اماں کل میں اور جم پیونسی کی نمناک گیلی زمین میں جا کر بھونرے پکڑینگے"!

"اچھا۔ یہ بات ہے"، ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر دل میں سوچنے لگی کہ حالانکہ

سوکھی روٹی کے ٹکڑے نوعمر لڑکوں کی بھوک مٹانے کے لئے مناسب خوراک نہیں تو بھی چونکہ ایسی روٹی کھانا لڑکے کے خیال کے مطابق مشنری ٹریننگ کا ایک حصّہ ہے۔ لہذا اُسے جانا ہی چاہیئے۔ پس وہ بولی "مَیں باورچن سے کہہ دونگی کہ کل صُبح وہ خشک ٹکڑے تُمہارے لئے تیار رکھے"۔

لڑکا:۔ اماں جان شکریہ۔ لیجئے مَیں سونے جاتا ہُوں۔ گڈ نائٹ!"

ماں:۔ "گڈ نائٹ میرا بچہ۔ خُدا تجھے برکت دے"۔

لڑکا تو اپنے بستر پر جا لیٹا لیکن مسز ونیل اکیلی بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔ اپنے خاوند کے انتقال کر جانے کے بعد اکثر اُس کو اپنی تنہائی کا احساس ہُوا کرتا تھا لیکن اس بات سے کہ اُس کا بچہ تو اُس کے پاس ہے وہ کسی قدر تسلی حاصل کر لیا کرتی تھی۔ اب اُس کی تمام توجہ اپنے بچّے پر مرکوز تھی اور وہ حتےالوسع اس کوشش میں تھی کہ کس طرح وہ اپنے بچہ کو ایسی تعلیم و تربیت دے جس سے وہ جوان ہو کر نیک نام پیدا کرے اور اپنی تمام عُمر خُدا کی خدمت میں صرف کرے۔ اب بچہ مشنری بننے کی باتیں کرنے لگا تھا۔ ماں کی دلی دُعا یہ تھی کہ کاش وہ اپنی خواہش و ارادہ کو تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو۔

" اماں کیا یہ مشن کا مکان ہے؟ یہ تو بہت ہی بڑا ہے۔ ہم اس میں کیونکر رہ سکتے ہیں جس حال کہ ہمارے گرد و نواح کے لوگ کچی کوٹھڑیوں میں رہتے ہیں؟

یہ ۱۸۸۹ء کا واقعہ تھا۔ تھیوڈور پنیل جو اس وقت ایک ڈگری یافتہ کامیاب شدہ ڈاکٹر تھا مع اپنی والدہ کے صُوبہ سرحد کے شہر بنوں کے مشن کے مکان کے باہر کھڑا مندرجہ بالا الفاظ کہہ رہا تھا۔ مکان کا برآمدہ نہایت وسیع تھا اور اُس کے منقش ستونوں پر خوبصورت رنگ برنگ کے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں۔ مکان

کے دروازے کھلے تھے جن میں سے ایک بڑا ہال نظر آ رہا تھا۔ نوکر صاف سفید لباس پہنے اپنے مالک اور مالکہ کا استقبال کرنے کو دونوں جانب ایستادہ تھے۔ ولایت کے لوگ انگلستان میں رہ کر ڈاکٹری شہرت اور نیک نامی حاصل کرنے کے عوض ہندوستان کی سرحدی اقوام کے درمیان خدمت اختیار کرنے کی خود انکاری اور ایثار نفسی کی کچھ قدر و وقعت نہ کرتے تھے۔ لیکن پنیل کو انگلستان کی نسبت یہاں بہت زیادہ آرام نظر آ رہا تھا۔ فوراً اس کا خیال اُن ایام کی طرف گیا جبکہ وہ سوچتا تھا کہ مشنری سوکھی روٹی کھاتے اور جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ اُس کے ذہن میں مشنری زندگی کا تصور کچھ اور تھا۔ اُس کے خیال کے مطابق مشنریوں کو اُن لوگوں کی مانند جن کی وہ خدمت کرتے تھے زندگی بسر کرنا چاہئے تھا۔ خیر اب مکان تو موجود تھا ہی اور اُس کی والدہ اپنی ضعیفی کی وجہ سے زیادہ تکلیف برداشت کرنے کے قابل بھی نہ تھی۔ سو انہوں نے اُسی میں سکونت اختیار کی۔ اور پنیل اپنے دل میں سوچنے اور کہنے لگا کہ اگر مجھے اس بڑے مکان میں رہنا ہے تو کم از کم میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ اُس کے دروازے کھلے رکھوں اور ہر خاص و عام کو اُس کے اندر آنے کی دعوت دوں۔

پنیل بنوں پہنچتے ہی سرحدی دستورات کو سیکھنے اور سمجھنے میں بہ دل و جان مشغول ہو گیا۔ اُس نے فرش پر بیٹھنا اور اپنی انگلیوں سے دال یا پلاؤ کھانا سیکھ لیا۔ سرحدی لباس یعنی شلوار۔ ڈھیلا کرتا اور پگڑی زیب تن کئے اور بہت جلد شہر کے تمام باشندے اُس کی شکل و شباہت سے بخوبی واقف ہو گئے۔

انگریز یہ دیکھ کر بہت گھبرائے اور بعض نے اُس سے یہ کہہ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ اگر تم یہاں کے باشندوں کی پوشاک پہنو گے اور اُن کی خوراک کھاؤ گے تو کوئی تمہاری عزت نہ کریگا۔ ہم لوگ تو فقط اپنی قوت، رُعب اور زور و طاقت سے

ہی سرحد کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے ہیں۔ تم بہت جلد قتل کر دئے جاؤ گے اور پھر فساد برپا ہوگا"۔

پنیل نے ان کے جواب میں یوں کہا۔ "تم غلط کہتے ہو۔ اگر میں ان لوگوں کا اعتبار اور اُن کا یقین کرونگا تو یقیناً یہ بھی مجھ سے ایسا ہی سلوک روا رکھینگے"۔

اُس کا خیال بالکل درست تھا۔ لیکن اُن لوگوں پر اپنا اعتبار قائم کرنے کے لئے وقت کی ضرورت تھی۔ جب اُس نے یہاں کی زبان سیکھ لی تو اُس نے اوّل شہر میں۔ بعدازاں گرد و نواح کے دیہات میں منادی کرنا شروع کیا۔ پہلے تو لوگ اُس کے قریب نہ آتے تھے۔ کیونکہ ایک انگریز کو سرحدی لباس میں دیکھنا اُن کے لئے تعجب خیز بات تھی۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اس میں ضرور کوئی بھید ہوگا۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ ایک انگریز کیوں اُن کے درمیان پھرتا اور مُفت علاج کرتا ہے۔ لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ اُس کے علاج معالجے سے کوئی ہولناک واقعہ نہیں ہُوا بلکہ اس کے برعکس ایک عجیب و غریب جراحی کے عمل کے بعد اندھے بینائی حاصل کر لیتے ہیں تو اُن کا خوف جاتا رہا اور اُنہوں کے قرب و جوار میں اُس کی شہرت پھیل گئی۔ بعدازاں جہاں کہیں وہ جاتا لوگوں کا ایک ہجوم اُسے آگھیرتا تھا۔

اکثر اوقات ایسے مریض اُس کے پاس لائے جاتے جن کی جانیں اس قدر خطرے میں ہوتیں کہ ہسپتال میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن وہاں دُور دُور تک ہسپتال کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ پنیل اور اُس کی والدہ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ضرور ایک ہسپتال بنوائیں گے۔ چونکہ اُن کے پاس کافی روپیہ نہ تھا۔ لہٰذا اُنہوں نے دُھوپ میں سکی ہوئی کچی اینٹوں اور لکڑی کے چند تختوں سے فقط ایک عارضی سی عمارت کھڑی کر لی۔ لیکن جو مریض اُس کے

اندر داخل کئے جاتے تھے وہ اسی میں اپنے گھروں کا سا آرام حاصل کر لیتے تھے۔
اگر کوئی مریض کسی دور دراز مقام سے آتا تو اُس کے تمام خاندان کو اُس کے پلنگ کے قریب ہی رہنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ اس بندوبست سے ایک اور تکلیف بھی حل ہو گئی اور وہ یہ کہ باورچی خانوں کی ضرورت نہ رہی۔ مریض کے رشتہ دار ہی اُس کی خوراک پکانے اور سہم پہنچانے کا انتظام کرتے تھے اور ساتھ ہی اس کے ہسپتال کے وارڈوں میں خدا کے پاک کلام کی منادی سُنتے تھے۔ اس طرح پر اُن لوگوں نے خدا کی بیش بہا محبت کا علم حاصل کیا۔
شروع میں پینل کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ عرصہ تک وہ لوگ اُس کے علاج اور طریقۂ علاج پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ وہ اُن کو جان سے مارنے کے درپے ہے اور اُس کے پیٹھ موڑتے ہی اُن صاف پٹیوں کو جو زخموں پر باندھی جاتی تھیں اُتار پھینکتے اور اُن کے عوض بھیڑ و بکریوں کی میلی کچیلی کھالوں کو جن کے وہ عادی تھے زخموں پر باندھ دیتے تھے۔ اُن کے حکیم بُخار کے لئے کسی قسم کا شربت جس میں ایک کاغذ کا پُرزہ ہوتا تھا مریض کو پلاتے تھے اور کاغذ پر قرآن شریف کی کوئی آیت تحریر کی ہوتی تھی۔ یا وہ مریض کو تعویذ دیتے تھے جس کے پہننے سے اُن کے اعتقاد کے مطابق عام بیماری دُور ہو جاتی تھی۔ پس ان لوگوں کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کی دوا سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔
وہ ڈاکٹر کے صفائی پسند خیالات اور ہدایات کا علانیہ مذاق اُڑاتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ رواں پانی سے بڑھ کر اور کوئی پانی صاف نہیں ہوتا۔ خواہ اُس رواں پانی میں شہر بھر کی تمام نالیوں اور بدروؤں کا گندہ سے گندہ پانی ہی کیوں نہ آگرتا ہو۔ بعض مقامات میں جہاں پانی کی قلت تھی لوگ فقط شادی یا عید کے موقعوں پر ہی غسل کیا کرتے تھے۔

کہ اُن کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ خوب نظر ڈالنے کے بعد انہیں معلوم ہُوا کہ ان میں سے ایک پٹھان اور دوسرا گو پٹھانی لباس پہنتے ہے لیکن درحقیقت پٹھان نہیں۔

گاؤں کے سردار نے یہ کہہ کر اُن کا خیر مقدم کیا "اللہ تیرے ساتھ ہو"

اُنہوں نے جواب میں کہا "اور تیرے ساتھ بھی۔ ہم لوگ بنوں سے آئے ہیں"۔

گاؤں کے لوگ پینل کی طرف اشارہ کر کے بول اُٹھے "یہ کون ہے؟ اس نے ہمارا لباس تو پہنا ہے لیکن اس کی زبان غیر ہے۔ اس کی سُنہری عینک کو دیکھو!

کسی نے جواب میں کہا "یہ تو ہسپتال کا فرنگی ہے"۔

کسی اور نے غضبناک آواز میں پوچھا "یہ کافر یہاں کیوں آیا ہے۔ اس نے مومنوں کا لباس کیوں پہن رکھا ہے؟"

پینل نے مسکراتے ہوئے بلند آواز سے کہا "میں دوائے کر آیا ہوں۔ اے سردار اگر تیرے لوگوں میں سے کوئی بیمار ہے تو کیا تو اجازت دیتا ہے کہ میں اس کا علاج کر دوں"؟

یہ سُنتے ہی لوگ آگے بڑھے۔ اور ہاتھ پھیلا کر گولیوں اور پوڈروں کے لئے درخواست کرنے لگے۔ گویا ایک ہی لمحہ میں انواع و اقسام کے امراض پھوٹ نکلے۔ ایک بولا "صاحب ایک پوڈر دیجئے۔ سات روز سے مجھے دردِ شکم کی تکلیف ہے۔ دوسرے نے کہا "صاحب میری نظر جاتی رہی۔ مجھے میری بینائی دوبارہ مل جائے"۔ ہر طرف سے مدد کی پکار اُٹھی۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ اگر اس وقت میرے بیس ہاتھ بھی ہوتے تو سب کے سب دوا تقسیم کرنے میں مصروف ہوتے۔

اس اثنا میں پاس کے گاؤں کا مُلّا اپنی مسجد کے سایہ میں بیٹھا اُونگھ رہا

تھا۔ یہ دوپہر کے قریب آرام کا گھنٹہ تھا۔ دفعتہً ایک طالب العلم یہ الفاظ کہتا ہُوا اُس
کے آرام میں مُخل ہُوا "مُلا صاحب بیدار ہو جیے۔ مَیں آپ کو ایک خبر دینے آیا ہُوں"
مُلا۔ لڑکے خاموش ہو۔ مجھے تنگ کیوں کرتا ہے اور کیوں میرے آرام میں
حارج ہوتا ہے؟

لڑکا۔ "صاحب۔ اُٹھئے۔ بید کے درختوں والے گاؤں میں ایک کافر آیا ہے
اور گاؤں کے تمام لوگ اُس کے گرد جمع ہیں۔ وہ اُنہیں دوائیں دے رہا اور یسوع
مسیح کی بابت بتا رہا ہے۔ مَیں دوڑ کر آپ کو بتانے آیا ہُوں۔"

مُلا۔ "اے سُست الوجود۔ تُو دوڑ کر نہیں بلکہ رینگ کر آیا ہے۔ جا قرآن
شریف اُٹھا لا۔ باقی طالب العلموں کو بھی بیدار کر۔" مُلا صاحب کی حنائی ریش لگی
جھومنے اور وہ گھبرا کر لگے بکنے "خُدا کی لعنت اُس پر پڑے۔ اللہ تمام کافروں
کو غارت کرے۔"

بید کے درختوں والے گاؤں میں ہنیوڈ ورپنیل منادی کرنے میں مصروف
تھا اور گاؤں کے لوگ سُننے میں مشغول۔ اُس کے ہاتھ میں مقدس لوقا کی انجیل
تھی جو پشتو زبان میں لکھی تھی۔ وہ چند آیات پڑھتا پھر ان کی تشریح کرتا جاتا تھا۔
لوگ توجہ سے سُنتے اور گاہے گاہے یہ الفاظ سُنائی دیتے تھے "کیا عُمدہ الفاظ ہیں۔"
"درست" "درست" وغیرہ وغیرہ۔

یکایک بھیڑ کے سرے پر کچھ شور سا ہُوا پھر آوازیں بلند ہوئیں۔ اور آخرکار
ایک شخص جس کے چہرے سے دہشت ٹپکتی تھی بھیڑ کو چیرتا ہُوا آگے بڑھتا نظر آیا۔
پنیل کے قریب پہنچ کر وہ غضب ناک ہو کر اُسے بکنے اور مُکے دکھانے لگا۔ اور
گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ پھر ہجوم سے مخاطب ہو کر اُن کو لعنت و ملامت
کرنے لگا کہ وہ ایک بدمعاش مسیحی کے فریب میں آ گئے۔ طالب علم اُس کی تائید

کرتے اور لوگوں کو اُکساتے اور بھڑکاتے رہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ ڈاکٹر کی حمایت کرتا کیونکہ سب ملا کی لعنت سے خوفزدہ تھے سیکے بعد دیگرے وہ ہٹتے چلتے گئے حتیٰ کہ آخرکار صرف پنیل اور اس کا پٹھان کارندہ اکیلے رہ گئے۔ اب وہاں ٹھہرنا بے سود تھا پس انہوں نے اپنی چیزیں باندھ لیں اور گھر کا رُخ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دن کی تمام محنت و مشقت ضائع ہو گئی لیکن پنیل پست ہمت نہ ہوا۔ پتھروں کی بوچھاڑ کے باوجود پنیل کے چہرے پر مسکراہٹ تھی کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس لڑکے کا چہرہ تھا جس کا زخم اس نے دھو کر صاف کیا تھا۔ پھر اس پر دوا لگا کر پٹی باندھی تھی۔ اس کی شکریہ سے بھری آنکھیں پنیل کے پیش نظر تھیں لہذا اسے یقین تھا کہ اگر پھر کبھی یہاں آنا ہوا تو کم از کم اسے ایک دوست تو ضرور ملیگا۔

جب کبھی ممکن ہوتا ڈاکٹر اس قسم کے سفر کیا کرتا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کا ہندوستانی مددگار ہسپتال کا کام کرتا اور مسز پنیل مریضوں کی تیمارداری کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس کے دوست بنتے گئے۔ حالانکہ گرہی۔ گرد اور پتھر تو ویسے کے ویسے ہی رہے تو بھی جب کسی گاؤں کا ایک۔ مریض بھی مشن ہسپتال سے شفا حاصل کر کے خوشی خوشی اپنے گھر واپس گیا وہاں ڈاکٹر کا ہمیشہ شاہانہ استقبال کیا جاتا تھا۔ اس کی خاطر بھیڑ ذبح کی جاتی اور شب کے وقت سب اکٹھے ہو کر پلاؤ کے طشت کے گرد بیٹھتے اور چراغوں کی مدھم روشنی میں طشت میں ہاتھ ڈال ڈال کر خوب مزے سے باہم مل کر کھاتے اور ہڈیاں کتوں کو جو قریب ہی جمع رہتے پھینکتے جاتے تھے۔

جب پنیل نے پہاڑوں پر جانا شروع کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ہر شخص کھیت میں کام کرتے وقت اپنی بندوق کو اپنے کندھے پر ڈالے رکھتا ہے اور کہ ہر

گاؤں مثل ایک قلعہ کے ہے جس کے گرد تین فٹ چوڑی دیوار بنی ہوتی ہے۔ اکثر اوقات جب پینل ایک گاؤں سے روانہ ہو کر دوسرے کو جاتا تو گاؤں والے مسلح پہرہ دار اُس کے ہمراہ بھیجتے جو اُس کو اپنے گاؤں کی حد تک پہنچا کر واپس چلے آتے تھے۔ اپنی حد سے باہر جانا اُن کے لئے یقینی موت تھا کیونکہ ایک گاؤں والے دوسرے گاؤں والوں کے جانی دشمن ہوتے ہیں لیکن تھیوڈور پینل جس کے ہتھیار فقط اُس کی دوائیاں اور اُس کی بائبل تھے آزادی کے ساتھ گاؤں گاؤں سفر کرتا پھرتا تھا

سالہا سال تک اُس کے سر کی قیمت مقرر کر دی گئی تھی۔ ملا اُس کی کامیابی کے باعث غضبناک تھے لہذا اُنہوں نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی پینل کو قتل کریگا فردوس بریں میں غیر فانی خوشی پائیگا۔ لیکن پینل نے اُن کی گیدڑ بھبکیوں کی کچھ پروا نہ کی۔ موسم گرما میں ایک شب وہ ایک گاؤں کی جانب سفر کر رہا تھا اور اُسے ایک ویران اور وحشتناک مقام میں سے گزرنا تھا۔ دن کے وقت گرمی اس شدت کی پڑتی تھی کہ بیچارے ڈاکٹر نے فیصلہ کیا کہ رات کو سفر کرے۔ چلتے چلتے تاریکی اس قدر بڑھ گئی کہ اُس کا ٹٹو بھی جو اندھیرے میں چلنے کا عادی تھا رُک رُک جاتا تھا لہذا ڈاکٹر اُس کی پیٹھ پر سے نیچے اُتر گیا اور خیال کیا کہ جب تک چاند نہ نکل آئے کچھ دیر وہاں ہی آرام کرلے۔ وہ راہ کے کنارے کھلے میدان میں لیٹ گیا اور سو گیا پاس اُس کا وفادار ٹٹو کھڑا پہرہ دیتا رہا۔

کچھ عرصہ کے بعد پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ پٹھانوں کا ایک گروہ لوٹ مار پر آمادہ اور کامل طور پر مسلح اُدھر آنکلا۔ وہ گھوڑے کو اکیلا دیکھ کر حیران ہوئے کہ ہیں! یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ فوراً ارادہ کیا کہ اُسے چُرا لیں پھر اُن کی

نگاہ اُس خوابیدہ مرد پر پڑی جو وہاں گہری نیند سو رہا تھا۔ بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو بنوں کا ڈاکٹر صاحب ہے۔ پس چونک اُٹھے اُن میں سے ایک بولا "آہ! آج اللہ نے اُسے ہمارے ہاتھوں میں دے دیا!"

دوسرا پکار اُٹھا "آؤ اس کافر کتّے کا کام تمام کر دیں"

فوراً سب نے اپنے چھرے نکال لئے اور اُس کے قریب آ گئے۔ لیکن پینل اُسی طرح بے خبر سوتا رہا۔ وہ ایسے سو رہا تھا گویا اپنے گھر میں اپنے پلنگ پر استراحت فرما رہا ہو۔ اُس کا چہرہ اطمینانِ قلبی اور حقیقی خوشی کے نُور سے منور تھا۔ یہ دیکھ کر تمام ڈاکو یکے بعد دیگرے پیچھے ہٹ گئے۔

پھر اُن میں سے ایک بولا "ہم اُسے کس طرح قتل کر سکتے ہیں۔ غیر مسلح انسان کو مارنا بزدلی ہے۔ وہ تو یوں سو رہا ہے کہ گویا سپاہیوں کا ایک لشکر اُس کی نگرانی کر رہا ہے۔ ہم ایک ایسے شخص کو جو نہ کسی سے ڈرے اور نہ کسی پر شک کرے اور ایسی میٹھی نیند سوئے کس طرح مار سکتے ہیں"؟ مندرجہ بالا الفاظ ڈاکوؤں کے سردار نے کہے اور پیٹھ پھیر کر وہاں سے چل دیا۔ باقی ڈاکو بھی اُس کے ہمراہ روانہ ہو گئے اور رات کی تاریکی نے فوراً ہی اُنہیں چھپا لیا۔

پینل کو بہت عرصہ کے بعد اس رات کی کیفیت معلوم ہوئی کہ کس طرح وہ گویا موت کے مُنہ میں پڑنے سے بچا تھا۔

"اشہد ان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"! مشرقی پہاڑوں پر آفتاب عالمتاب کی کرنیں پڑ رہی تھیں اور موذن شہر بنوں کی بڑی مسجد کے منار پر کھڑا اذان دے رہا تھا۔ اور گویا اہالیان شہر کو غفلت کی نیند سے بیدار کر کے اُن میں پھر زندگی کا دم پھونک رہا تھا۔ ہر طرف چولھوں سے اُپلوں کی آگ کا دھواں اُٹھ

رہا تھا۔ برہنہ پا لڑکے آنکھیں ملتے ہوئے اپنے مالکوں کی دکانوں سے تختے اُتار رہے تھے۔ مستورات برقعے پہنے گلیوں کے نلکوں سے پانی بھرتے ہوئے ایک دوسرے کو سلام علیک کہہ رہی تھیں۔ وہ اسی دُھن میں تھیں کہ کس طرح مردوں کے اُٹھنے سے پیشتر اپنے گھڑے بھر کر گھر پہنچ جائیں۔

مشن کے گرجہ گھر کے گھنٹہ کی آواز بھی قدرے سُنائی دے رہی تھی جو مسیحیوں کو عبادتِ صبح کی دعوت دے رہا تھا۔ عبادت کے بعد مشن سکول اور ہسپتال کا کام شروع ہوتا تھا لیکن سکول کے پرنسپل اور تھیبوڈور پنیل کا کام اس سے ایک گھنٹہ پیشتر شروع ہو جاتا تھا۔ تمام دن مریضوں کا معائنہ کرنے۔ آپریشنوں۔ مذہبی گفتگو کرنے اور مریضوں کے علاج کے لئے اُن کے گھروں میں جانے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مزید براں ڈاکٹر صاحب سکول میں بھی پڑھایا کرتے تھے اس لئے دن کو دُعا بندگی کے لئے کوئی وقت نہ نکل سکتا تھا۔ لہذا پنیل رات کی آرام کی گھڑیوں میں سے وقت چرا کر دعا میں صرف کرتا تھا طلوعِ آفتاب سے پیشتر جبکہ ہنوز تاریکی شب ابھی باقی ہی ہوتی تھی وہ اُٹھ کھڑا ہوتا اور خُدا کے حضور دو زانو ہوتا اور دن بھر کے کام کاج کے لئے طاقت وہدایت کی التجا کرتا تھا اسی وقت کبھی کبھی اُس کے دل میں شک پیدا ہوتا تھا کہ آیا وہ ٹھیک کام کر رہا ہے یا نہیں؟

وہ سالہا سال سے خُدا کے کلام کی منادی کر رہا تھا لیکن اب تک وہ جنہوں نے اُس کلام کو قبول کیا تھا معدودے چند تھے۔ مریضوں کا یہ حال تھا کہ ہسپتال بھر جاتا بلکہ بعض کے لئے جگہ بھی نہ رہتی تھی حالانکہ پنیل نے مدّت ہوئی کئی بار ایک اور ڈاکٹر کا مطالبہ کیا۔ روپے کے لئے درخواست کی تاکہ نیا ہسپتال بنایا جائے۔ ان کے لئے بہت دُعائیں بھی کیں لیکن نہ تو ڈاکٹر بھیجا گیا اور نہ ہی روپیہ ملا۔

اس سے اُس کی ہمت پست ہو جاتی اور وہ سوچتا کہ شاید مَیں غلطی پر ہوں۔ پھر اُسے یاد آتا کہ اُس نے بازار میں سادھوؤں کے گروہ دیکھے تھے جو ہمیشہ نیم برہنہ ہوتے اور اُن کے جسم پر خاک ملی ہوتی تھی۔ اُن کے بالوں کی لٹیں بنی ہوتیں اور اُن کا بعض بالوں کا رنگ اُڑ کر وہ گویا سن کی مانند نظر آتے تھے۔ پینل کو تو وہ انسان بھی نہ معلوم ہوتے تھے لیکن ان سادھوؤں میں سے بعض ہندوستان کے قدیمی علوم میں ماہر تھے اور بعض اپنے مذہب کے لئے مختلف اقسام کی جسمانی تکلیفیں اور ایذائیں برداشت کرتے تھے مثلاً اپنے جسم کو چھریوں سے کاٹتے۔ فاقہ رکھتے اور سڑکوں کے کناروں پر مدتوں تک بے حس و حرکت بیٹھے رہتے تھے۔ ہندو اُن کو ایسا کرتے دیکھ کر اُن کی پرستش کرتے اور ہر قسم کا اختیار اُن کے سپرد کر دیتے تھے جس حال کہ اُن کی واحد امید یہ ہوتی تھی کہ وہ اس دنیا کی مصیبتوں سے رہائی پائیں پینل چاہتا تھا اور دل سے چاہتا تھا کہ وہ اُن کو نجات کی حقیقی راہ کی بابت بتائے جو خُداوند یسُوع مسیح کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ یُوں سوچتا تھا کہ ہم مشنری جو اس قدر مصروف رہتے ہیں آیا ہم دُرستی پر ہیں۔ ہمارے سکول۔ کالج اور ہسپتال ہیں اور ہم ہر وقت اُن سے متعلق اُمور میں مصروف و مشغول رہتے ہیں۔ اگر ہم ان مقدس و نادار سادھوؤں کی مانند پھرتے رہیں اور ایسے طریق پر مسیح کی منادی کریں جو عوام کی سمجھ میں آ جائے تو شاید ہمارا کلام مؤثر ہو اور ہم آخرکار اُن کو مسیح کے قدموں میں لے آئیں؟ ایک عرصہ تک اس پر غور کرنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ مَیں اس طریقہ کو آزما کر دیکھونگا۔ پس اُس نے ہسپتال کا کام اپنے ہندوستانی کارندے کے سپرد کیا اور خود تین ماہ کے لئے اپنی بائیسکل پر اِدھر اُدھر دورہ کرنے کا ارادہ کیا۔

جب اُس نے سکول کے طلباء کو اپنا فیصلہ بتایا تو جہان خان نے جو بڑے

لڑکوں میں سے ایک تھا اُس سے کہا "جناب! ہر سادھو کے ساتھ ایک چیلہ ہوتا ہے جو اُس کے لئے بھیک مانگتا اور رہنے کے لئے جگہ تلاش کرتا ہے۔ وہی اپنے گرُو کے پرارتھنا کرتے وقت لوگوں سے بات چیت کرتا ہے آپ مجھے اپنا چیلہ بنالیں اور مجھے اپنے ساتھ جانے کی اجازت دیں۔"

پینل :- "لیکن ہم تو مسیحی ہیں نہ کہ ہندو۔ شاید ہم کو کھانا بھی نصیب نہ ہو۔ اور کوئی بھیڑ ہمارے گرد جمع نہ ہو۔"

جہان خان :- "جناب خدا سب کچھ مہیا کریگا۔"

پینل :- "اچھا۔ چلو تم بھی میرے ہمراہ چلو"۔

پس سادھوؤں کے سے قیصری رنگ کے کپڑے پہن کر دونو روانہ ہوئے راستہ دُشوار اور کٹھن تھا بلکہ بعض اوقات تو کوئی راہ بھی نظر نہ آتی تھی۔ وہ گہری ریت میں سے گزرتے اور اپنی بائیسکلوں کو اپنے سر پر اُٹھائے ہوئے دریاؤں پر سے عبور کرتے ہوئے چلتے گئے۔ پتھریلی زمین پر چلنے سے بائیسکلوں کے ٹائر پُرزہ پُرزہ ہوگئے۔ لیکن اس سے پینل کی ہمت پست نہ ہوئی۔ اُن کی جیبیں خالی تھیں اور وہ آبادی سے میلوں دُور تھے۔ لہذا پینل نے ٹائر کے غلاف کو اپنے پائجامہ سے بھر دیا اور اس طرح بائیسکل کو چلاتا رہا۔ پھر کسی شہر میں پہنچے۔ وہاں کسی بے چارے مسیحی نے اُسے چند کپڑے دئے۔

دریاؤں نے بھی ایک دقت پیش کی اور وہ یہ کہ انہوں نے پینل کو اُن مقامات تک پہنچنے سے روکا جہاں وہ پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ جگہیں جہاں تمام سادھو جاتے تھے سرحد سے بہت دُور پہاڑوں کے اُوپر تھیں۔ اُنہوں نے بائیسکلوں کا استعمال محض اس لئے کیا تھا کہ ان تین ماہ کے اندر وہ وہاں پہنچکر واپس بھی آسکیں۔

جب وہ پہلے دریا پر پہنچے تو انہیں معلوم ہُوا کہ دریا کو عبور کرنے کا فقط ایک ذریعہ ہے اور وہ سرکاری کشتی ہے۔ ملاح نے ایک آنہ کرایہ طلب کیا اور یہاں پیسہ تک ندارد۔ آخر پینل نے کہا "ہم تو سادھو سنت ہیں اور کوئی دُنیوی مال و دولت نہیں رکھتے۔ کیا تُم ہم کو مُفت پار لے جاکر اپنے لئے برکت نہ حاصل کروگے؟"

ملاح نے جواب دیا اور کہا "محرر چنگی سے دریافت کرو۔ شاید وہ تُم کو اجازت دے دے"۔

پینل "لیکن وہ تو دریا کے اُس پار ہے۔ مَیں اُس سے کیونکر پُوچھوں؟"

بے چارا ملاح حیران تھا کہ کیا کرے یہ مسئلہ کیونکر حل ہو۔ سر کھجلانے لگا اور دفعتہً بول اُٹھا "تُم میں سے ایک جائے۔ پُوچھے اور واپس آجائے"۔

پینل نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا "ہم دونوں جاتے ہیں۔ آؤ میرے چیلے تُم بھی چلو"۔

جب وہ دونو دریا کے اُس کنارے پہنچے تو محرر صاحب نے اُنہیں جانے دیا۔ ایک اور پل پر انگریزی سپاہیوں کی ایک کمپنی پار جانے کو تیار کھڑی تھی اُنہوں نے اُن کا محصُول دیا۔ اسی طرح وہ بڑھتے چلے گئے کوئی نہ کوئی خُدا کا بندہ اُن کی مدد کرتا رہا۔ آخرکار ایک مقام پر پہنچ کر صاف انکار کا سامنا کرنا پڑا۔ مدد کے لئے کوئی قریب نہ تھا سوچا کہ شاید واپس ہی نہ جانا پڑے۔ پس وہ بیٹھ گئے۔ کچھ مدت بعد چند اعلےٰ طبقہ کے ہندو اشنان کرنے آئے۔ پینل اُنہیں دیکھ کر انگریزی زبان میں یوں بولا:۔

"بھائیو۔ گڈ مارننگ۔ تُم پر سلامتی ہو"!

"تم پر بھی۔ تُم کہاں سے آئے ہو"؟

پینل "مَیں بنوں سے آیا ہوں اور چاترا کو جا رہا ہوں"۔

ہندوؔ۔ لیکن تُم تو برہمن نہیں۔ تُمہارا اُستاد کون ہے اور تم کس کی تعلیم دیتے ہو؟"

پنیلؔ۔ "میرا اُستاد خُداوند یسُوع مسیح ہے اور میری تعلیم یہ خوشخبری ہے کہ اُس نے دُنیا کی نجات کی خاطر اپنی جان قُربان کر دی"۔

ہندوؔ۔ لیکن تُم یہاں کیا کر رہے ہو؟

پنیلؔ۔ "مَیں اور میرا چیلہ دریا پار کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں"۔

ہندوؔ۔ "تُم تو بڑے پُرجوش انسان معلُوم ہوتے ہو۔ ہندو بن جاؤ اور ہندو کُتب مقدسہ یعنی ویدوں کی تعلیم دو تو کرایہ ہم دیتے ہیں"۔

پنیلؔ۔ "نہیں یہ تو مَیں ہرگز نہیں کرونگا۔ کیونکہ جس شخص نے ایک مرتبہ میرے اُستاد کی پیروی کی خوشی محسوس کر لی ہو وہ کسی دوسرے کا پیرو نہیں ہو سکتا"۔

ہندوؔ۔ تو بس تُم واپس شہر چلے جاؤ۔ شاید وہاں کوئی ادنیٰ ذات مسیحی تمہاری مدد کرے تو کرے ہم تو ہرگز ایک پیسہ بھی تُم کو نہ دینگے"۔

پنیلؔ۔ "میرے دوستو خُدا خُود سب کُچھ مہیا کر دیگا"۔

اُن اعلےٰ ذات ہندوؤں نے اُن سے متنفر ہو کر اپنی پیٹھ پھیری اور اشنان کرنے دریا کے کنارے اُتر گئے۔ پنیل اور اُس کا ساتھی پھر بیٹھ گئے۔ اُسی وقت ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آ پہنچا۔ اُس نے بڑی بے اعتنائی سے سادھوؤں پر نظر ڈالی لیکن فوراً ہی حیران ہو کر چلّا اُٹھا "پنیل تم اس عجیب لباس میں یہاں کیا کر رہے ہو"؟

پنیلؔ۔ "مَیں تو اپنے چیلے کے ہمراہ جاترا کیلئے جا رہا ہوں لیکن تم سرحد سے اتنی دُور کیا کر رہے ہو؟

افسرؔ۔ "میں یہاں ایک خاص کام کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ کیا تُم بِل

کے پار جانا چاہتے ہو؟ ادملاح ادھر آؤ۔"

پنیل "لیکن میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں۔"

افسر: بس یہی تکلیف ہے۔ لو کرایہ میں دیتا ہوں۔ لیکن ہاں کچھ اور تو بتاؤ۔ بھئی یہ تو خوب قصہ ہے آج شب کو اسے مس (Mess) میں سناؤنگا!

یہ کہہ کر وہ ہنستے ہوئے کشتی پر سوار ہو گیا۔

پنیل نے مڑ کر برہمنوں کی جانب نظر کی جو حیرت زدہ ہو کر یہ سب ماجرا دیکھ رہے تھے۔ پھر اُن سے مخاطب ہو کر بولا "دیکھا۔ کس طرح خدا نے دُور دراز سے ہمارے لئے مدد بھیجی ہے"!

اسی طرح وقت گزرتا گیا اور وہ ایک مقام سے دوسرے تک سفر کرتے گئے۔ حالانکہ وہ مسیحی تھے تو بھی جہاں کہیں وہ جاتے اُن کا سادھوانہ لباس اُن کے لئے دروازے کھلوا دیتا تھا۔ پنیل حیران تھا کہ کس مہربانی کے ساتھ لوگ اُن سے پیش آتے تھے۔ کیا غریب کیا امیر سب اُن کو دوست سمجھتے اور وہ گھنٹوں اُن کے ساتھ بحث مباحثہ کرتے تھے۔ لیکن اُن سادھوؤں سے مل کر جن کو ملنے وہ خاص گھر سے نکلا تھا۔ پنیل نہایت مایوس ہوا۔ چند ایک اُن میں سے پنیل کے ساتھ بولے لیکن اکثروں نے انکار کیا کیونکہ بعض اُن میں سے خاموشی کا حلف اُٹھا چکے تھے اور بعض مدت دراز تک نہ بولنے کی وجہ سے طاقت گویائی سے محروم ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں اپنے ضلع سے بہت دُور نکل جانے کے بعد پنیل وہاں کے لوگوں کی زبان سے ناواقف تھا۔ کچھ عرصہ بعد پنیل کو اپنے کام کی کشش محسوس ہونے لگی۔ اُس کے ہاتھ جو فنِ جراحی میں ماہر تھے مدت سے بیکار رکھے۔ آخرکار اُسے یہ احساس ہوا کہ گو سادھوانہ زندگی ایک طرح سے فائدہ مند ہے تو بھی حقیقی معانی میں سادھو بننا ہندوستانیوں کا ہی کام ہے۔

پس وہ اپنے سرحدی مقام میں واپس آگیا۔ اور اُسی طرح عوام کی بھیڑ اُس کے گرد جمع ہو گئی۔ پھر وہی علاج و معالجہ کے مطالبات۔ وہی جھگڑے اور وہی مُلّاؤں کی مخالفت و عداوت جاری ہو گئی۔ جوں جوں اُس کی شہرت بڑھتی گئی توں توں اُن کی دُشمنی بھی زیادہ ہوتی گئی۔ اُنہوں نے ہر طرح کوشش کی کہ اُس کا کام بندکر دیں لیکن اُس کا جوش اور شوق اور زیادہ ہوتا گیا۔ بازاری منادی نے سب سے زیادہ مشکل پیش کی۔ لیکن پنیل نے ارادہ کر لیا تھا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ پنیل نے اپنے شہر میں منادی کرنے کی جرأت نہ کی۔ ہسپتال کے مریضوں کے رُخصت ہو جانے کے بعد وہ مسیحیوں سے یوں دریافت کرتا تھا۔ "آج شام کون آرہے ہیں"؟ جواب ملنے پر وہ کہتا "آؤ چلو۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر کسی قسم کا فساد ہو جائے تو کسی پر ہاتھ نہ اُٹھانا۔"

اس کے بعد وہ سب روانہ ہوتے۔ دن کی گرمی اب قدرے کم ہے۔ گلی کوچے اُن لوگوں کی بھیڑ سے پُر ہیں جو بیٹھے باتیں کرتے یا مٹھائی اور سبزی فروشوں سے بحث کر رہے ہیں۔ گدھے۔ گائیں۔ جنگلی کتے ادھر اُدھر پھر رہے ہیں تاکہ جو کچھ نظر آئے کھا جائیں۔ گاڑیبان بھیڑ کو پکارتے اور چیرتے ہوئے اپنی گاڑیوں کے لئے راہ بناتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر اور اس کے ساتھی بھی اسی بھیڑ میں شامل منادی کے مقام کی جانب بڑھے چلے جاتے ہیں۔ گاہے گاہے اُن کے پُرانے مریض اُنہیں پہچان کر سلام عرض کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مُلّاؤں کی مخالفت کے باوجود بھی اپنے ڈاکٹر صاحب سے محبت رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ صدائیں آتی ہیں "سلام ڈاکٹر صاحب۔ دیکھئے میری ٹوٹی ٹانگ اب بالکل درست ہے۔" "ڈاکٹر صاحب خدا آپ کو برکت دے۔ میرا بچہ اب بالکل صحت یاب ہو گیا ہے۔"

آج شہر میں معمول سے زیادہ بھیڑ ہے کیونکہ آج میلہ ہے اور گردونواح

کے قبائل اپنی بھیڑ بکریاں گھوڑے وغیرہ فروخت کرنے اور ان کے عوض کپڑا اور دیگر ضروری اشیاء خریدنے آتے ہیں پہلے ان میں سے اکثر سے واقف نہیں لیکن ان کو دیکھ کر فوراً یہ کہتا ہے " واہ! آج کیسا نادر موقع ہے کہ ان لوگوں کو وہ خوشخبری سنائی جائے جو اُنہوں نے اس سے پیشتر کبھی نہیں سُنی"۔ اس کو یہ خیال تک نہیں آتا کہ شاید یہ سُننے سے انکار کریں یا کہ اس کے ساتھی کسی قسم کے خطرہ میں مُبتلا ہیں اور اگر کبھی یہ خیال آتا بھی ہے تو وہ اُس کی مُطلق پرواہ نہیں کرتا۔

فساد برپا ہوگیا۔ اکثر اوقات تو بھیڑ ان کا کلام سُن لیا کرتی تھی لیکن آج ان کے شور و غُل کے باعث اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ پھر ایک ہندوستانی اُٹھا اور اُس کے اُٹھتے ہی فوراً شور مچ گیا۔ "او کافر مسیحی کُتا۔ رُو گرداں - برگشتہ" کے الفاظ کان پڑے۔

مسیحیوں میں سے ایک ڈاکٹر صاحب سے کہتا ہے " صاحب مستورات سب رُخصت ہوگئیں اب فساد ہُوا ہی چاہتا ہے۔ ہم کیا کریں؟"

ڈاکٹر " سب ایک ساتھ ہو جاؤ۔"

پتھر برسنے شروع ہو گئے۔ اب ڈاکٹر کے سر پر کسی نے لکڑی اس زور سے ماری کہ وہ بے چارا زمین پر جا پڑا۔ اُس کے ساتھیوں پر بھی حملہ ہُوا لیکن یہ اُن کی مدد نہیں کرسکتا۔ خود زمین پر پڑا ہے اور کوئی اُسے ٹھوکروں سے اُڑائے جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چلاتا بھی جاتا ہے۔ دفعتہً اُس نے مارنا بند کردیا۔ ڈاکٹر نے اُدپر نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ بھیڑ گویا جادُو کے اثر سے غائب ہوتی جا رہی ہے پھر معلوم ہُوا کہ ہندوستانی سپاہیوں کا ایک گروہ اُدھر سے نکل رہا ہے۔ خُدا نے وقت پر مدد بھیج کر اُس کی جان بچائی!

یہ فقط پینل کی خوش خلقی جرأت وجسارت اور سب کے ساتھ دوستانہ سلوک ہی تھا جس کے ذریعہ سے جنگلی و وحشی سرحدی لوگ اُس کی جانب کھنچ آئے اور پھر اُس کے ذریعہ سے اُس کے خُداوند اور آقا کے قدموں میں آگئے تھے۔ مسیحی ہونا گویا حقیقی معانی میں ایک مردانہ زندگی بسر کرنا ہے۔ کیونکہ اس میں بعض اوقات خود اپنے ہی خاندان کے شرکاء کے ہاتھوں مار کھانا۔ بے عزتی و ذلت برداشت کرنا اور جائداد کا ترک کر دینا بلکہ بعض اوقات موت سے بھی دوچار ہونا ہے۔ تو بھی ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ان تمام مصائب کا مقابلہ کیا۔ اور اپنی زندگیوں کے ذریعہ سے اپنے خُداوند یسُوع مسیح کی قدرت کی گواہی جوانمردی کے ساتھ دی لیکن بعض ایسے تھے جن سے ان مصائب اور تکالیف کا بار نہ اُٹھ سکا لہذا وہ واپس چلے گئے۔

تائب خان ان آخرالذکر کے زمرہ میں سے تھا۔ اُس نے طالب العلمی کے زمانہ میں ہی مسیحیت کو قبول کیا تھا اور افغانستان میں اُس کے دیگر شرکائے خاندان متواتر اُس کی منت وسماجت کرتے رہتے تھے کہ وہ اسلام میں پھر واپس آجائے۔ آخر کار وہ پشاور میں اُس سے ملاقات کرنے آئے۔ اب اُس کے ایمان میں تذبذب پیدا ہُوا اور اُس کے ارادہ کی پختگی میں ضعف آگیا۔ وہ ایک نہایت ہی نازک وقت میں سے گزر رہا تھا اور ڈاکٹر پنیل جو اُس کی کشمکش کو خاموشی کے ساتھ دیکھ رہا تھا اس کے لئے نہایت فکرمند تھا۔ ایک شام جبکہ آفتاب غروب ہونے کو تھا اور تاریکی شب آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر دُنیا کو ظلمت کی چادر میں لپیٹی جارہی تھی۔ پنیل تمام دن کے کام سے چُور ہو کر آرام کر رہا تھا کہ دفعتہً کوئی یہ کہتا ہُوا اس کے آرام میں مخل ہُوا۔

 "صاحب! صاحب! تائب خان چلا گیا۔ وہ ہوسٹل

ہیں نہیں ہے۔ لڑکے کہتے ہیں کہ اُنہوں نے آج تیسرے پہر اُسے اپنے خاندان کے ہمراہ بازار میں دیکھا تھا۔"

پینل کُود کر اُٹھا اور بولا" تو پھر اب تو وہ بالکل دُور نکل گیا ہوگا۔ ہمیں فوراً اُس کے پیچھے جانا چاہیئے۔"

دیر تک کوئی شخص نہ ملا جو اُن کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اُس خطرناک مہم پر لے جاتا اور یُوں بہت سا قیمتی وقت ضائع ہوگیا۔ آخر کار ایک بوڑھا شخص ایک ٹوٹا ہوا یکہ لے کر حاضر ہوُا۔ اُس کا گھوڑا اپنے مالک اور یکّے دونوں سے زیادہ بوڑھا اور مرحل تھا۔ خیر یہ اسی میں سوار ہو کر چل دیئے ٹوٹا پھوٹا یکا اُس خستہ اور ناہموار راستہ پر بمشکل تمام چل رہا تھا۔ اور بے چارے پینل اور اُس کے ساتھی کا جو حال تھا وہ ناگفتہ بہ ہے۔ میلوں سفر کرنے کے بعد بھی مفروروں کا کچھ سراغ نہ ملا۔ نائب ڈاکٹر صاحب کا نیا مرید تھا۔ لہذا اُنہیں خیال تھا کہ اگر اب نہ پکڑا گیا تو پھر کبھی اس کی شکل نہ دیکھونگا۔

کوئی نصف شب کے قریب گاڑیبان نے ایک چھوٹے گاؤں خرم نامی کے پاس پہنچکر اپنا گھوڑا روکا اور بولا" بس صاحب میرا گھوڑا اب اور آگے نہیں جا سکتا۔ ہم پینتیس میل سفر طے کر چکے ہیں"۔

دیر تک دریافت کرنے کے بعد اُن نیم خوابیدہ دہقانوں نے بتایا کہ اُنہوں نے ایک نوعمر لڑکے اور اُس کے ساتھیوں کو مسجد میں عصر کی نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ لیکن وہ وہاں ٹھہرے نہیں بلکہ اس وقت بندہ میں جو یہاں سے تقریباً گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے آرام کر رہے ہونگے۔

پینل اور اُس کا ساتھی یہ سُن کر مایوس ہو گئے اور پست ہمت ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی محنت رائیگاں گئی کہ اتنے میں

اُنہیں بگل کی دھیمی سی آواز سنائی دی اور افغان نوجوان بول اُٹھا۔ "صاحب! ڈاک گاڑی جا رہی ہے اگر ہم کو اُس میں جگہ مل جائے تو شاید ہم اب بھی اُسے جا پکڑیں"

ڈاک گاڑی میں اُنہیں جگہ مل گئی اور وہ روانہ ہوئے۔ قریب ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد وہ بندہ پہنچ گئے اور گاڑی سے اُتر پڑے۔ گاڑی چل گئی اور یہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ اب اُنہوں نے اپنی چادریں اوڑھ لیں اور اپنے چہرے اُس میں چھپا کر اور پاؤں سے جوتیاں اُتار کر وہ اُس خوابیدہ گاؤں میں گویا بدروح کی مانند آہستہ آہستہ دبے پاؤں اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ مہمان خانہ دیکھا وہ بالکل خالی پڑا تھا۔ لیکن چاند کی روشنی میں مسجد خوب نظر آ رہی تھی۔ اُس کے اندر تیرہ آدمی اپنی چادروں سے اپنے چہروں کو لپیٹے بے خبر سو رہے تھے۔ اب کس طرح معلوم ہو کہ وہ جس کی تلاش میں وہ ہیں کونسا ہے۔ اگر کہیں غلطی سے کسی اور پر ہاتھ پڑ جائے تو فوراً ایک درجن خنجروں کا وار اُن پر ہو۔ لیکن افغانوں کی یہ خاصیت ہے کہ اُن کو رات کی تاریکی میں کمال آہستگی اور خوش اسلوبی سے کام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ پس وہ افغان نوجوان دبے پاؤں بڑھتا گیا اور آہستہ آہستہ ہر ایک کے چہرے پر سے چادر اُٹھا کر دیکھتا گیا حتیٰ کہ وہ ثاقب خان تک پہنچ گیا۔ پینل نے قدم بڑھا کر اُسے چھوا۔ وہ بھی افغانوں کے حسب عادت بغیر کچھ کہے یا شور کئے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے اُستاد کو فوراً پہچان کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

پینل نے آہستہ سے پوچھا "کیا تم ہمارے ساتھ واپس چلو گے؟"

لڑکا بغیر بولے ساتھ ہو لیا۔ خرم پہنچنے تک اُن کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ اور جسمانی طاقت و ہمت جواب دے رہی تھی۔ لیکن وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ گھوڑا اتنی مدت ستانے کے بعد تازہ دم ہو گیا ہے۔ پس وہ

بنوں کی جانب روانہ ہوئے اور طلوع آفتاب سے پیشتر گھر پہنچ گئے لیکن اُن
کی یہ محنت درحقیقت برباد ہی گئی کیونکہ تائب ہمیشہ مثل ایک مسلے ہوئے سرکنڈے
کے ہی رہا اور آخرکار چند سال بعد اپنے گاؤں واپس چلا گیا اور پھر کبھی واپس
نہ آیا۔

اُن پٹھان مسیحیوں کے لئے بہت مشکل تھا کہ جب لوگ اُن کا مضحکہ اڑاتے
طعنے دیتے یا اُن پر حملہ کرتے تو یہ اس کے عوض اُنہیں کچھ نہ کہہ سکتے۔ کیونکہ تمام
عمر اُن کو یہی سکھایا گیا تھا کہ بے عزتی کا جواب خنجر سے ہی دیا جاتا ہے لیکن آخر
اُن کے اسی رویہ اور سلوک ہی کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ اُن کے دشمن اور مخالفین
اُن کے دوست بن گئے اور مسیحیوں کا شمار بڑھتا گیا۔ لیکن ہنوز افغانستان کا
دروازہ اُن کے لئے بند تھا۔ جو مسیحی وہاں گئے تھے اُن کو نہایت بے رحمی سے
ساتھ قتل کیا گیا تھا تو بھی پینل اس بات کا نہایت آرزومند تھا کہ مسیح کا نشان
اُس ممنوعہ ملک میں نصب کیا جائے۔ بار بار اُس نے امیر سے اجازت چاہی
لیکن ہمیشہ انکار ہی کیا گیا۔ کبھی کبھی وہ یہ خیال کرتا کہ کیا یہ دروازہ کبھی نہ کھُلیگا؟
معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ ہی بند رہیگا لیکن اس اثنا میں خود بنوں شہر
میں ہنوز بہت کام تھا اور ہر روز صبح تا شام پینل کام میں مصروف رہتا تھا۔

ایک روز پینل علی الصبح ایک چھوٹے شہر تھل نامی کی طرف روانہ ہوا جو
دامن کوہ میں واقع تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو شہر نہایت خوبصورت اور رونقدار
معلوم ہوا کیونکہ برسات کا موسم شروع تھا اور اس سے پیشتر رات کو بارش ہو چکی
تھی اور شہر کے تمام اشجار و سبزہ تر و تازہ و صاف نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب
اور اُن کے کارندوں نے شہر کے باہر اپنے ڈیرے لگا لئے۔ کچھ عرصہ کے بعد لوگ
آنے شروع ہو گئے اور دن کا کام شروع ہو گیا۔ دفعتہً کچھ شور سا ہوا اور

لوگوں کی زبانوں سے لفظ "افریدی" سُنائی دیا اتنے میں چار قوی ہیکل پیل پیکر افریدی بھیڑ کو چیرتے ہوئے آ وارد ہوئے۔

قبل کے باشندے جو برٹش انڈیا کی حدود پر مقیم تھے ان وحشی اقوام سے جو سرحد کی دوسری جانب رہتی تھیں ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے کیونکہ وہ ان پر اکثر حملہ آور ہوتیں اور اُن کے مال مویشی کو لوٹ لے جاتی تھیں بلکہ بعض اوقات اُن کے بچوں کو بھی گرفتار کر کے لے جاتی تھیں اور بڑی رقم لے کر اُن کو رہا کرتی تھیں۔ یہ لوگ تلواروں اور ایسے تیز افغانی چھُروں سے مسلح تھے جو ایک ہی وار میں انسان کے اعضا کو جسم سے جدا کر سکتے تھے۔ اپنی بندوقوں کو وہ اپنی حد کے اندر ہی چھوڑ آئے تھے۔ اُن میں سے ایک پینل سے یوں مخاطب ہوا "اللہ تیرے ساتھ ہو"۔ پینل نے جو اس وقت ایک مریض کی مرہم پٹی کر رہا تھا یہ الفاظ سن کر اپنا سر اُوپر اُٹھایا اور جواب میں کہا "تیرے ساتھ بھی ہو"۔ افریدی بولا "ہم بنوں کے ڈاکٹر صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں"۔

پینل۔ "میں ہی بنوں کا ڈاکٹر ہوں"۔

افریدی۔ "لیکن ہم نے تو سُنا ہے کہ وہ فرنگی ہے اور تم ۔ ۔ ۔" اُن کا خیال تھا کہ وہ ایک انگریز کو سفید سُوٹ پہنے اور ٹوپی لگائے پائینگے۔ اور یہاں اس دراز قد داڑھی مونچھ والے شخص کو سودی لباس میں دیکھ کر اُن کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔

پینل اُن کی حیرانی کو دیکھ کر مُسکرایا اور بولا "ہاں میں وہی ہوں کہو کیا چاہتے ہو؟"

افریدی۔ "ہم اپنے آقا چکائی کی طرف سے ایک پیغام لے کر آئے ہیں"۔

چکائی کا نام سنتے ہی تمام لوگوں پر ایک دہشت طاری ہوگئی۔ کیونکہ چکائی ایک مشہور قاتل۔ قانون شکن شخص تھا اور حالانکہ وہ ایک غریب پنہارے کا بیٹا تھا تو بھی اس وقت وہ آٹھ ہزار رفل برداروں کا سردار تھا بھلا اُسے ڈاکٹر صاحب سے کیا کام پڑگیا۔ کیا یہ ڈاکٹر کو بھگا لے جانے کی کوئی چال تھی بھیڑ ڈاکٹر صاحب کے قریب آگئی۔

پینل :- "پیغام کیا ہے"؟

افریدی :- "جناب اُن کے گھر میں بیماری ہے۔ اور وہ منّت کرتے ہیں کہ آپ براہ مہربانی آکر اُن کی مدد کریں"۔

لوگوں کا گنگنانا بلند ہوتا گیا۔ بعض بولے" بیشک یہ سازش ہے"۔ دوسروں نے کہا" ہاں لیکن ہمارے ڈاکٹر صاحب کب ان کے جال میں پھنسنے لگے"۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سنائی دئے" چلو۔ میں چلتا ہوں"۔ لوگ حیران کھڑے ہیں سوچتے ہیں کہ ڈاکٹر دیوانہ ہوگیا۔ وہ اُسے ایذا پہنچائینگے۔ قتل کر ڈالینگے یا شاید اُسے قید کرلیں اور جب تک سرکار ہزار ہا روپیہ نہ دے اُسے رہا نہ کریں۔ شور و غل زیادہ ہوتا گیا لیکن پینل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا وہ گویا یہ تمام باتیں سنتا ہی نہ تھا۔ اُس کی نظریں پہاڑوں پر لگی تھیں۔ خیال کرتا تھا کہ اب وہ موقع ہاتھ آگیا جس کے لئے وہ مدتِ مدید سے دُعا کر رہا تھا۔ ممنوعہ ملک کا دروازہ قریب ہے اور اُس کے نصب العین کی جانب ایک قدم اور! گھنٹوں گذر گئے۔ وہ چھوٹا سا سواروں کا جلوآ ہستہ آہستہ پہاڑی راستہ پر بل کھاتے ہوئے چڑھتا جا رہا ہے۔ پینل اور گروہ کا سردار گھوڑوں پر سوار ہیں۔ باقی پا پیادہ اُن کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ اُن سے بہت اُوپر زور کا طوفان چلتا ہوا نظر آتا ہے اور بادلوں کا گرجنا سنائی دیتا ہے گو جہاں وہ اس

وقت ہیں وہاں آفتاب کی روشنی خوب چمک رہی ہے۔ اب وہ ایک درہ پر پہنچ گئے اور یکایک سردار چلّا اُٹھا "صاحب دیکھو سامنے پانی کا سیلاب آرہا ہے۔ ہمیں گھوڑوں کو خوب تیز لے جانا چاہیئے"۔

پینل نے دریا کی طرف نظر دوڑائی اور دیکھا کہ قریب ایک میل کے فاصلہ پر دریا کا پانی سیلاب کی صورت میں نہایت تیزی اور طغیانی کے ساتھ بہتا چلا آرہا ہے۔ خیال کیا کہ کیا ہم دریا کے پایاب گھاٹ تک پہنچ سکتے ہیں یا نہیں؟ پھر انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر خوب تیز دوڑایا اور پار ہو گئے۔ پاپیادہ اشخاص بھی گھوڑوں کی رکابوں کو پکڑے ہوئے ساتھ ہی ساتھ پیچھے چلے گئے۔ اُن کے پار ہوتے ہی زور کے پانی کا شور سُنائی دیا۔ ہانپتے ہوئے پیچھے نظر کرتے ہیں اور کیا دیکھتے ہیں کہ وہ چھوٹا سا پہاڑی نالہ اب ایک زبردست چوڑے دریا کی مانند بہہ رہا ہے۔ عین وقت پر دریا پار ہو گیا۔

دن خوب چڑھ گیا تھا لیکن وہ ہنوز چلتے ہی جا رہے تھے۔ آخرکار ایک عمیق وادی میں پہنچے جس کے گرد اُونچی اُونچی چٹانیں ہیں۔ راستہ وہاں سے ایک اور طرف سے ہو کر جاتا ہے اور سامنے اُن سے بہت بلندی پر ایک قلعہ ہے۔

سردار نے کہا "یہ چنارک ہے"۔

پینل نے نظر اُٹھائی اور دیکھا کہ پہرہ داروں کی پگڑیاں گویا آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ وہ ایسا رفیع مقام تھا کہ محض چند ایک نشانہ باز کافی تھے کہ کھڑے ہو کر ایک پوری پلٹن کا مقابلہ کر کے اُن کو آگے نہ بڑھنے دیں۔

اُن کے قریب پہنچنے پر وہ بڑا دروازہ کھُل گیا۔ اور پہرہ دار حیرانی سے گنگناتے اور کہنے لگے کہ "یہ اجنبی شخص کون ہے؟ اگر یہ قیدی ہے تو اسے باندھ کر کیوں نہیں لائے اگر نہیں تو یہ غیر مسلح کیوں آیا؟" پینل چاروں طرف نظر دوڑانے

لگا اور سوچنے لگا کہ اگر یہ کوئی سازش ہے تو بچنے کا کوئی چارہ نہیں۔ ان وحشیوں میں سے تو کوئی بھی بخوشی مجھے قتل کر ڈالیگا۔ پھر دیکھا کہ اُن کا سردار اُس کے استقبال کو آگے بڑھا۔ ایک لمحہ کے لئے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک طرف تو خونخوار آنکھوں والا سیاہ ریش قانون شکن قاتل اپنی جدید وضع کی رفل اور ریوالور لئے کھڑا تھا اور دوسری جانب دراز قد نیلی آنکھوں والا انگریز غیر مسلح کھڑا تھا۔

سردار:۔ صاحب تو آگیا"۔

پنیل:۔ ہاں بس آگیا۔

سردار:۔ اللہ تیرے ساتھ ہو۔

پنیل:۔ ہاں۔ اے سردار تیرے ساتھ بھی ہو"۔

پھر سردار نے تبسم کناں کہا "صاحب کیا تجھے خوف نہ آیا"۔

پنیل:۔ "میرے دوست کیا میں تیرا مہمان نہیں؟"

سردار:۔ "خوب! مگر تو درحقیقت بہادر آدمی ہے"۔

کچھ دیر آرام کرنے اور کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مریضوں کا معائنہ کرنا شروع کیا۔ جس شخص کو دیکھنے کے لئے ڈاکٹر خاص بُلایا گیا تھا۔ اُس کی ٹانگ بندوق کی گولی سے زخمی تھی۔ اُس کے اُوپر بکری کی کچی کھال بندھی تھی اور وہ شخص تیز بخار میں جل رہا تھا کیونکہ اُس کے خُون میں زہر سرایت کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پنیل نے وہ بدبودار کھال الگ کی اور زخم کو دھویا۔ پھر مریض کی بیوی سے جو پسِ پردہ کھڑی تھی یُوں مخاطب ہُوا۔ "لو یہ مرہم اور ہر روز اُس کو زخم پر لگایا کرو اور میں بُخار کو دُور کرنے کے لئے ایک ٹھنڈی دوا بھیجونگا۔ خاطر جمع رکھو یہ ضرور صحت یاب ہو کر پھر انہی پہاڑوں پر گشت لگایا کریگا"۔

مریض کی بیوی۔ "اللہ تعالیٰ تجھ کو برکت بخشے"۔
باہر اور مریضوں کی بھیڑ کھڑی تھی ۔ اور اُن کو دیکھنے اور علاج تجویز کرنے میں کافی وقت صرف ہُوا۔ جب یہ کام ختم ہو چکا تو پینل سردار کے صحن میں پہنچایا گیا۔ سردار کے قریب ایک بدطینت شخص مُلّا کا لباس زیب تن کئے بیٹھا تھا ۔ پینل نے خیال کیا کہ اب مصیبت شروع ہوئی لیکن چکائی نے آگے بڑھ کر اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "مَیں نے سُنا ہے کہ تم طبیب کے علاوہ انجیل کے مبشر بھی ہو۔ مَیں مدت سے اس کی نسبت سُننے کا منتظر ہُوں پس مَیں اپنا مُلّا لے کر آیا ہُوں۔ تم اور وہ اس مضمون پر بحث کرو اور مَیں فیصلہ کرونگا کہ کون حق پر ہے"۔ جب اُس نے دیکھا کہ پینل اپنے چوگرد سرحدی قبائل کے بدمعاش موذیوں پر نظر ڈال رہا ہے تو بولا۔ "صاحب مت ڈرو۔ بے شک یہ تمام بدمعاش ہیں لیکن اگر ان میں سے ایک نے بھی تم کو کچھ کہا تو مَیں فوراً اُسے گولی سے اُڑا دُونگا۔

سردار خاموشی کے ساتھ مُلّا اور پینل کی گفتگو بغور سنتا رہا۔ آخر کار مُلّا نے جب دیکھا کہ وہ بحث میں قائل کُن دلائل پیش کرنے میں قاصر ثابت ہو رہا ہے۔ تو اُس نے سوالات پُوچھنا بند کر دیا۔ دوسری صبح جب چکائی پینل کو الوداع کہنے آیا تو پینل نے عہد جدید کی ایک جلد اُسے دی جسے اُس نے بخوشی قبول کیا اور پینل سے یُوں کہا۔ "صاحب پھر تشریف لائیے ۔ مَیں چکائی اس کوہستان کا باشندہ آپ کی سلامتی و عافیت کا ضامن ہونگا۔ آپ یہاں آکر نہ صرف علاج معالجہ ہی کریں بلکہ انجیل کی منادی بھی کریں ۔ اللہ حافظ! خیرباد!

سالوں کی منت سماجت کے بعد ایک اور ڈاکٹر بنوں میں بھیجے گئے۔ اور اب ۱۶ سال کی سخت محنت و جانفشانی کے بعد پینل کو انگلستان جانے کا موقع

ملا۔ وہ خوشی سے اس وقت کا منتظر تھا لیکن اب اُس کی خوشی کامل نہ تھی۔ کیونکہ اُس کی والدہ جو اُس کی تمام عمر اُس کے ساتھ رہی تھی اس وقت ضعیف العمری کی وجہ سے اُس کے ہمراہ جانے کے قابل نہ تھی۔ ماں نے بیٹے سے کہا کہ مَیں نہیں جاؤنگی کیونکہ مَیں اس قدر کمزور اور عمر رسیدہ ہُوں کہ شاید مَیں راہ ہی میں ختم ہو جاؤں۔ اور چونکہ مَیں چاہتی ہُوں کہ مَیں ہندوستان میں ہی جس کو مَیں اپنا ملک تصوّر کرتی ہوں دفن کی جاؤں۔ لہٰذا مَیں یہاں ہی رہونگی "۔

پس پنیل اکیلا سوئے انگلستان روانہ ہُوا اور وہاں پہنچتے ہی اُس نے اپنی والدہ کے انتقال کر جانے کی خبر سُنی۔ یہ اُس کے لئے بڑا زبردست صدمہ تھا تو بھی وہ اپنے کام میں مشغول رہا اور جا بجا جلسے منعقد کرتا پھرا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو اُس کی خواہش بھی ہوتی کہ وہ باقاعدہ اپنا کام جاری رکھے۔

چھ ماہ بعد وہ پھر ہندوستان پہنچ گیا اور تھوڑے عرصہ بعد اُس نے ایک ہندوستانی لیڈی ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ ان کا نام ایلس سہراب جی تھا۔ پنیل جانتا تھا کہ یہ خاتون اُس کو بخوبی سمجھ سکتی اور اُس کی حقیقی رفیق کار اور مددگار بن سکتی ہے۔ شہر بنوں کے باشندے ڈاکٹر کی شادی کی خبر سُن کر بہت خوش ہوئے۔ وہاں کے مسلمان یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اُس نے اتنی مدّت تک شادی کیوں نہ کی بلکہ ایک بڑھیا نے تو طنزاً یہ بھی کہا۔ کہ ہیں ! "اُس نے ایک ہی عورت کے ساتھ بیاہ کیا ہے"! اور جب اُنہیں یہ معلوم ہُوا کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ ایک ہندوستانی خاتون اور اُن کی ہموطن ہے تو اُن کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ ان کی شادی سے پیشتر مستورات عموماً کم ہسپتال میں آتی تھیں کیونکہ وہ مرد ڈاکٹر سے علاج کرواتے گھبراتی تھیں لیکن اب چونکہ وہاں ایک عورت موجود تھی لہٰذا وہ بڑی تعداد میں آنے لگیں حتیٰ کہ سب کے لئے ہسپتال میں جگہ بھی نہ تھی۔

بعض کو تنبوؤں میں ڈالتے۔ بعض کو زمین پر لٹاتے اور بعض کو ڈاکٹر صاحب کے گھر رکھتے تو بھی پورا نہ پڑتا۔ پس پنیل نے پھر روپیہ جمع کرنے کی کوشش کی تاکہ نیا ہسپتال بنایا جائے۔ اب جب وہ دیہات میں دورہ کرتے تھے تو کسی قسم کی مخالفت اُن کے درپیش نہ آتی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ خود مُلا بھی اُن کے دوست بن گئے اور اُن کا استقبال کرتے تھے۔ جہاں کہیں وہ جاتے مریض ہر طرف سے آوارد ہوتے۔ جب کبھی وہ ریل کے ذریعہ دورہ کرتے تو بھی یہ خبر بجلی کی مانند پھیل جاتی اور ہر اسٹیشن پر مریضوں کا ہجوم جمع ہوجاتا۔ پنیل کا معمول تھا کہ خواہ کتنی بھی مصروفیت کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ لوگوں کی تکلیفوں کو سُننے اور اُن کو رفع کرنے کے لئے مستعد ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر مشن سکول کا چھوٹے سے چھوٹا لڑکا بھی آکر افسوسناک آواز میں کہتا۔ صاحب میرا گیند کھو گیا ہے تو پنیل اُس کی فریاد کو اُسی توجہ سے سُنتا جس توجہ سے وہ کسی بزرگ کے ساتھ ہسپتال سے متعلق کسی اہم ترین معاملہ پر غور کرتا تھا۔

مندرجہ ذیل واقعہ ۱۹۱۱ء کا ہے جبکہ دہلی دربار منعقد ہوا تھا۔ یعنی جب جارج پنجم ۱۹۱۰ء میں شاہِ انگلستان ہوکر ہندوستان میں شہنشاہِ ہند بنائے جانے کی ادائیگیٔ رسم کے لئے تشریف لارہے تھے۔ شہر دہلی کے گرد و نواح کے وسیع میدانوں میں تماشہ بینوں کے لئے عالیشان عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں اور بڑے بڑے خیمے نصب کئے گئے تھے۔ لوگ مُلک کے تمام اطراف و اکناف سے جمع ہو رہے تھے تاکہ شہنشاہِ ہند کی تاجپوشی کا نظارہ کریں۔ ڈاکٹر اور مسز پنیل بھی اسی غرض سے دہلی آگئے۔ وہ بھی ایک عجیب منظر تھا۔ دربار کا میدان ریاستوں کے راجاؤں اور نوابوں سے پُر تھا جو زربفت اور کمخواب کے خلعت ہائے فاخرہ پہنے حاضر تھے۔ اور برطانوی

افسران اپنی چمکدار وردیوں میں اپنی بیویوں کے ہمراہ جن کے زنگارنگ کے لباس دیکھ کر طاؤسِ خوشرنگ بھی شرما جاتا تھا موجود تھے۔ سواروں کا ایک جلوس نکلنے کو تھا جس میں تمام راجے اور مہاراجے اور شہزادگان شامل تھے۔ امیر و غریب سب دیکھنے کو مستعد کھڑے تھے۔ سواروں کی کوشش یہی تھی کہ ہر ایک اپنی شان و شوکت اور کرّوفر میں دوسرے پر سبقت لے جائے گھوڑوں کے ساز وغیرہ کی ساخت میں بھی سیم و طلاء کا خوب استعمال کیا گیا تھا۔ جوں جوں شہزادوں اور راجاؤں کی سواریاں گذرتیں توں توں بھیڑ کی زبان سے تعریف کے کلمے نکلتے تھے۔ سرحد کے سرداروں کا ایک گروہ بھی جلو میں شامل سب کے بعد نمودار ہوا۔ چونکہ وہ اپنے پیشرووں کی مانند زردار نہ تھے۔ لہٰذا وہ اُن کی مانند پُرشان بھی نہ تھے۔ حالانکہ اُن کے چہروں سے تکبر اور آنکھوں سے غضب و وحشت عیاں تھی تو بھی کسی نے اُن کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ اُن کے گزرتے وقت فقط ایک شخص نے تالی بجائی۔ سردار حیرت زدہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے اور سوچنے لگے کہ اس دُور دراز مقام میں کون ہے جسے ہماری فکر ہے۔ یکایک اُن میں سے ایک نے اُس دستار بند شخص کو پہچان لیا اور اپنے قریب والے سردار سے کہنے لگا "یہ تو ہمارے ڈاکٹر صاحب ہیں!" اُس نے جواب میں پُوچھا۔ "کون؟ ڈاکٹر پنیل صاحب"؟ فوراً یکے بعد دیگرے سب کو معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر پنیل یہاں موجود ہیں۔ دفعتہً نہایت زور سے سرحدی نعرہ بلند کیا گیا۔ سواروں نے اپنی تلواروں کو ہوا میں ہلاتے اور گھماتے ہوئے اُس کا جواب دیا۔ بھیڑ ادھر اُدھر حیران ہو کر دیکھتی ہے کہ یہ سوار کس سے مخاطب ہیں۔ اور کسی کو اُس ہجومِ غفیر میں یہ معلوم نہ ہوا کہ یہی وہی بے چارہ حلیم و فروتن مشنری ڈاکٹر ہے جس کی زندگی اور خدمت بقول ایک مشہور جرنیل "سرحد پر امن و امان قائم رکھنے میں سپاہیوں کے لشکر کی نسبت کہیں زیادہ کارآمد ثابت ہوئی تھی"۔

پنیل کی فتح اور ظفر مندی یہی تھی! آخر کار محبت دشمنی اور عناد پر غالب آئی اور پنیل کو معلوم ہوا کہ اُس کی زندگی بے سُود نہ رہی وہ ضائع نہیں ہوئی بلکہ اپنے خالق و مالک کی خدمت میں نثار کی گئی۔

اس کے ایک سال بعد پنیل کو اس سے مشکل تر امتحان کا سامنا کرنا پڑا۔ شہر بنوں پر ایک عجیب قسم کی خاموشی طاری ہے بھیڑ کے افراد جو عموماً باہم بات چیت کیا کرتے تھے۔ آج اُس تنگ گلی میں سے گزر کر ایک خاص سمت میں بڑھے جاتے ہیں۔ وہ آپس میں دبی آواز میں باتیں کرتے جاتے ہیں اور تیز رفتاری سے شہر کے دروازہ کی جانب گامزن ہیں۔ دو چار جو پہلے گئے تھے واپس آ رہے ہیں۔ سب یکبارگی اُن سے پُوچھتے ہیں:-

"اُس کا کیا حال ہے۔ کیا بخار دُور ہو گیا"؟

جواب "افسوس۔ اُس کی حالت بدتر ہے کہتے ہیں وہ قریب المو‌ت ہے"۔

ہسپتال کو پہنچنے کے تمام راستے لوگوں کے اژدحام کی وجہ سے بالکل بند ہیں کیونکہ تھیوڈور پنیل سخت بیمار ہے۔ جس وقت سے یہ خبر مشہور ہوئی تھی کہ ڈاکٹر صاحب بیمار ہیں اور وہ اپنے دوست کی جس کے خُون میں زہر سرایت کر گیا تھا جان بچاتے ہوئے خُود اسی مرض کا شکار ہو گیا لوگوں نے صحن اور باغ میں ڈیرے جما دئے۔ گھنٹوں اسی طرح ایک دوسرے سے لگے بیٹھے رہے۔

ہسپتال کے گرد بڑا ہجوم جمع تھا۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ جو اس قدر مضبوط اور توانا تھا مرنے کو ہے۔ اس سے پیشتر چند سال ہوئے ڈاکٹر صاحب بیمار ہو گئے تھے اور اُن کی صحت یابی پر تمام شہر نے خُوشی منائی تھی۔ سوچتے تھے کہ اُسی طرح اب بھی وہ یقیناً اُٹھ کھڑا ہو گا!

مسجدوں اور مندروں میں اُس کی صحت یابی کے لئے دُعائیں کی جا رہی

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں
باہتمام مسٹر ایف۔ ڈی وارث پرنٹر پبلشر
چھپکر پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور سے
شائع ہوئی